جناب وحید الدین خان صاحب

قانون سازی کا حق کسے حاصل ہے؟

ہمارے تمدنی اور معاشرتی مسائل کا قانون کیا ہو۔؟

اب وقت آگیا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ خدا کی رہنمائی کے بغیر انسان خود اپنے لئے قانون وضع نہیں کر سکتا۔ مذہب کے اندر میں وہ تمام بنیادیں صحیح شکل میں مل جاتی ہیں جو ایک معیاری قانون کیلئے ماہرین تلاش کر رہے ہیں۔ مگر وہ اب تک اسے پا نہ سکے۔ (ادارہ)

تمدنی مسائل کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے۔ کہ اس کا قانون کیا ہو۔؟ تمدنی مسائل انسانوں کے باہمی روابط سے پیدا ہوتے ہیں، اور ان روابط کو جو چیز منصفانہ طور پر متعین کرتی ہے، وہ قانون ہے، مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ آج تک انسان اپنی زندگی کا قانون دریافت نہ کر سکا۔ کہنے کو اگرچہ ساری دنیا میں قانونی حکومتیں قائم ہیں، مگر یہ تمام قوانین نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہیں بلکہ جبری نفاذ کے سوا ان کی پشت پر کوئی حقیقی وجہ جواز بھی موجود نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رائج الوقت قوانین اپنے حق میں علمی اور نظریاتی بنیاد سے محروم ہیں۔

فلر (L.L. FULLER) کے الفاظ میں قانون نے ابھی اپنے آپ کو نہیں پایا ہے اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے۔ "قانون خود اپنی تلاش میں"۔

THE LAW INQUEST OF ITSELF

دور جدید میں ان مسائل پر بے شمار لٹریچر تیار ہوا ہے، بڑے بڑے دماغ اپنی اعلیٰ صلاحیتیں اور اپنے بہترین اوقات اس کے لئے صرف کر رہے ہیں اور چیمبرز انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں "قانون کو ایک زبردست فن کی حیثیت دے کر اس کو عظیم ترقی تک پہنچا دیا ہے۔ مگر اب تک کی ساری کوششیں قانون کا کوئی متفقہ تصور حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ حتی کہ ایک عالم قانون

کے الفاظ ہیں۔ "اگر دس قانون دانوں کو قانون کی تعریف بیان کرنے کے لئے کہا جائے تو بلا مبالغہ ہم کو گیارہ مختلف قسم کے جوابات سننے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

ماہرین قانون کی مختلف اقسام کو الگ کرنے کے لئے انہیں مختلف مکاتیب فکر میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مگر ان کی قسمیں اتنی زیادہ ہیں کہ بہت سے مصنفین اس طرح کی اختیار کردہ وسیع ترین تقسیم کی حد بندیوں میں بھی نہیں آتے۔ مثال کے طور پر جان آسٹن (JOHN AUSTON) کے متعلق پروفیسر پیٹن (G.W. PATON) نے لکھا ہے کہ وہ ہماری وسیع قسم بندی (BROAD DIVISION) میں سے کسی ایک میں بھی پوری طرح موزوں نہیں بیٹھتا۔" (A TEXT BOOK OF JURISPRUDEKCE 1905 - P. 5)

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین قانون کو وہ صحیح اساس ہی نہیں ملی جس کی بنیاد پر وہ مطلوبہ قانون کی تشکیل کر سکیں۔ وہ قانون کے اندر جن ضروری قدروں کو یکجا کرنا چاہتے ہیں، جب وہ انہیں یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یکجا نہیں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ماہرین قانون کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مینڈکوں کی پنسیری بنا رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ پانچ مینڈکوں کو یکجا کرے گا تو دوسرے پانچ اس کے پلڑے میں سے پھدک کر نکل چکے ہوں گے۔ اس طرح معیاری قانون کو حاصل کرنے کی اب تک کوششیں صرف ناکامی پر ختم ہوئی ہیں۔ فرائڈمین (W. FRIEDMAN) کے الفاظ ہیں:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کیطرف لڑھک جایا کرے۔"

"LEGAL THEORY P-18"

جان آسٹن جس کی کتاب پہلی بار ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی، اس نے دیکھا کہ قوت نافذہ کے بغیر کوئی قانون نہیں بنتا، اس لئے اس نے قانون کی تعریف یہ کی:

"قانون ایک حکم ہے جو سیاسی طور پر اعلیٰ شخص (POLITICAL SUPERIOR) نے سیاسی طور پر ادنیٰ شخص (POLITICAL INFERIOR) کے لئے نافذ کیا ہو۔"

(A TEXT BOOK OF JURISPRUDEKCE - P-56)

اس تعریف میں قانون بس ایک صاحب اقتدار کا فرمان (COMMAND OF THE SOVEREIGN) بن کر رہ گیا۔ (پیٹن صـ۶)

چنانچہ بعد کو اس پر شدید اعتراضات کئے گئے۔ نیز حکمرانوں کی بدعنوانی دیکھ کر ذہنوں میں یہ تصور

ابھرا کہ قانون سازی میں قوم کی مرضی کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔ چنانچہ ایسے علمائے قانون پیدا ہوئے جنہوں نے کسی ایسے ضابطہ و قاعدہ کو قانون تسلیم کرنے سے انکار کیا جسکی پشت پر قوم کی رضامندی نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ضابطہ تمام اہل علم اور معلمین اخلاق کے نزدیک صحیح اور مفید ہونے کے باوجود محض اس لئے رائج نہیں ہو سکتا کہ رائے عامہ اس کے خلاف ہے مثلاً امریکہ میں شراب کی پابندی کے قانون کو امریکی قوم کی رضامندی نہ ملنے کی وجہ سے قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ اسی طرح برطانیہ میں قتل کی سزا میں ترمیم کرنی پڑی اور ہم جنسی جیسی قبیح حرکت کو قانون کی حد میں لانا پڑا۔ حالانکہ ملک کے جج اور سنجیدہ لوگ اس کے خلاف تھے۔

اسی طرح یہ بات بھی زبردست بحث کا موضوع رہی ہے کہ قانون قابل تغیر ہے یا ناقابل تغیر۔ قرون وسطیٰ اور زمانہ ماقبل تجدید (POST-RENAISSANCE PERIOD) میں قانون طبعی یا قانون فطرت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان کی جو فطرت ہے وہی قانون کا بہترین ماخذ ہے۔

"فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شئے پر حکومت کا حق خود اسی کے فطری تقاضوں اور رہنما اصولوں کو پہنچتا ہے اور انسان کے لئے قدرت نے یہ اصول اسکی عقل کی شکل میں پیدا کئے ہیں۔ لہذا انسان پر حکومت خود اپنی عقل کے زور سے ہی قائم کی جاسکتی ہے۔" (JURISPRUDENCE BY BODENHEIMER P-24)

اس تصور نے قانون کو ایک آفاقی بنیاد فراہم کردی۔ یعنی وہ ایک ایسی چیز سمجھا جانے لگا جس کو ہمیشہ ایک ہی رہنا چاہیئے۔ یہ سترویں اور اٹھارہویں صدی کا تصور قانون تھا۔ اس کے بعد دوسرا مکتب فکر پیدا ہوا اور اس نے دعویٰ کیا کہ قانون کے آفاقی قواعد معلوم کرنا بالکل ناممکن ہیں۔ کوہلر (KOHLER) لکھتا ہے:

"یہاں کوئی ابدی قانون (ETERNAL LAW) نہیں ہے۔ ایک قانون جو ایک عہد کے لئے موزوں ہو، وہی لازمی طور پر دوسرے عہد کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا۔ ہم صرف اس بات کی کوشش کر سکتے ہیں کہ ہر کلچر کے لئے اس کے مناسب حال نظام قانون کو فراہم کریں۔ کوئی چیز جو ایک کے لئے خیر ہو وہی دوسرے کے لئے مہلک ہو سکتی ہے۔" (PHILOSOPHY OF LAW)

اس تصور نے فلسفۂ قانون کا سارا استحکام ختم کر دیا۔ یہ تصور انسانی فکر کو اندھا دھند تغیر پذیری (RELATIVISM) کیطرف لے جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ کسی بنیاد سے محروم ہے اس لئے اسکی کوئی منزل

نہیں۔ یہ تصورِ زندگی کی تمام اقدار کو تلپٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔ پھر ایک گروہ نے ہر طرف سے سمٹ کر عدل کے پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ لارڈ رائٹ (LARD WRIGHT) ڈین راسکو پاونڈ (DEAN ROSCOE POUND) کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"راسکو پاؤنڈ ایک ایسی بات کہتا ہے، جس کی صداقت پر میں اپنے تمام تجربات اور قانونی مطالعہ کے نتیجے میں بالکل مطمئن ہو چکا ہوں۔ وہ یہ کہ قانون کا ابتدائی دور ہے۔ اور بنیادی مقصد ـــــ انصاف کی تلاش۔ (QUEST OF JUSTICE) ہے۔

(INTERPRETATION OF MODERN LEGAL PHILOSOPHIES, N.Y 1947, P-794)

مگر یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انصاف کیا ہے، اور اس کو کیسے متعین کیا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بات گھوم پھر کر دوبارہ وہیں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں آسٹن کو ہم نے چھوڑا تھا۔ اس طرح سینکڑوں برس کی تلاش و تحقیق کے باوجود انسان اب تک قانون کی تشکیل کے لئے کوئی واقعی بنیاد فراہم نہ کر سکا۔ یہ احساس روز بروز بڑھ رہا ہے کہ جدید فلسفہ، مقاصدِ قانون کے اہم مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ پروفیسر پیٹن (G. W. PATON) لکھتے ہیں:

"کیا مفادات (INTERESTS) ہیں جن کا تحفظ ایک معیاری قانونی نظام کو کرنا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اقدار سے متعلق ہے اور وہ فلسفۂ قانون کے دائرہ بحث میں آتا ہے ـــــ مگر اس معاملے میں ہم فلسفہ سے جتنی زیادہ مدد لینا چاہتے ہیں اتنا ہی اس کا حصول مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کوئی بھی قابلِ قبول پیمانہ اقدار (SCALE OF VALUES) اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ درحقیقت صرف مذہب ہی میں ایسا ہے کہ ہم اسکی ایک بنیاد پا سکتے ہیں۔ مگر مذہب کی صداقتیں عقیدہ یا وجدان کے تحت قبول کی جاتی ہیں۔ نہ کہ منطقی استدلال کی بنیاد پر۔"

(A TEXT-BOOK OF JURISPRUDENCE, P-104)

آگے وہ کچھ علمائے قانون کا یہ خیال نقل کرتا ہے کہ وہ مدتوں فلسفہ قانون کی بھول بھلیاں میں گردش کرنے کے بعد یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ فلسفۂ قانون کے مقصد کے فلسفیانہ مطالعہ کی جو کوشش کی ہے وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچی (صفحہ ۱۰۶) پھر وہ سوال کرتا ہے ـــــ کیا کچھ معیاری اقدار IDEAL VALUES ہیں جو ارتقائے قانون میں اسکی رہنمائی کرتی ہیں۔ (صفحہ ۱۰۸) ایسی اقدار اگرچہ اب تک دریافت نہیں ہو سکیں، لیکن وہ قانون کے لئے ناگزیر ہیں۔ مگر دقت یہ ہے کہ مذہب کو الگ کرنے کے حصول کی

کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

The orthodox natural law theory based its absolutes on the revealed truths of religion. If we attempt to secularize jurisprudence, where can we fined an agreed basis of values ? P-109.

یہ طویل تجربہ انسان کو دوبارہ اسی طرف لوٹنے کا اشارہ کرتا ہے۔ جہاں سے اس نے انحراف کیا تھا۔ قدیم زمانے میں قانون کی تدوین و تشکیل میں مذہب کا بہت بڑا حصہ ہوتا تھا چنانچہ تاریخ قانون کا ماہر سر ہنری مین (SIR HENRY MAINE) لکھتا ہے :

"تحریری طور پر منضبط قانون کا کوئی ایسا نظام، چین سے پیرو (PERU) تک ہمیں نہیں ملتا جو اپنے دور آغاز ہی سے مذہبی رسوم و عبادات کے ساتھ ہم رشتہ نہ رہا ہو۔"

(EARLY LAW AND CUSTOM, P-5)

اب وقت آگیا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ خدا کی رہنمائی کے بغیر انسان خود اپنے لئے قانون وضع نہیں کر سکتا۔ لاحاصل کوشش کو مزید جاری رکھنے کی بجائے اب ہمارے لئے بہتر ہوگا کہ ڈاکٹر فرائڈمین کے الفاظ میں ہم اعتراف کر لیں کہ :

"ان مختلف کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انصاف کے حقیقی معیار کو معین کرنے کے لئے مذہب کی رہنمائی حاصل کرنے کے سوا دوسری ہر کوشش بے فائدہ ہوگی۔ اور انصاف کے مثالی تصور کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لئے مذہب کی دی ہوئی اساس بالکل منفرد طور پر حقیقی اور سادہ بنیاد ہے۔"

(LEGAL THEARY, P-450)

مذہب کے اندر ہم کو وہ تمام بنیادیں نہایت صحیح شکل میں مل جاتی ہیں جو ایک معیاری قانون کے لئے ماہرین تلاش کر رہے ہیں۔ مگر وہ اب تک اسے نہ پا سکے۔

۱- قانون کا سب سے پہلا اور لازمی سوال یہ ہے کہ قانون کون دے۔ وہ کون ہو جسکی منظوری (SANCTION) کے کسی قانون کا درجہ عطا کیا جائے۔ ماہرین قانون اب تک اس سوال کا جواب حاصل نہ کر سکے۔ اگر حاکم کو بحیثیت حاکم یہ مقام دیں تو نظری طور پر اسکی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک یا چند

اشخاص کو دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حق کیوں دیا جائے اور نہ عملاً یہ مفید ہے کہ ایک شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جو چاہے قانون اور جسطرح چاہے نافذ کرے۔ اور اگر معاشرہ اور اجتماع کو "قانون ساز" قرار دیں تو یہ زیادہ مہمل بات ہے۔ کیونکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی وہ علم و عقل ہی نہیں رکھتا جو قانون سازی کے لئے ضروری ہے۔ قانون بنانے کے لئے بہت سی مہارتوں اور واقفیتوں کی ضرورت ہے جس کی نہ عام لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ان کو اتنا موقع ہوتا ہے کہ وہ ان میں حاصل کر سکیں۔ اسی طرح عملاً بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ معاشرہ کی کوئی ایسی رائے معلوم کی جاسکے جو سارے معاشرہ کی اپنی رائے ہو۔

موجودہ زمانے میں اس مسئلے کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ پوری آبادی کے عاقل اور بالغ افراد اپنے نمائندے منتخب کریں اور یہ منتخب لوگ اجتماع کے نمائندے کی حیثیت سے اجتماع کے لئے قانون بنائیں۔ مگر اس اصول کی غیر معقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ ۵۱ فیصدی کو صرف دو عددی اکثریت کی بناء پر یہ حق مل جاتا ہے کہ ۴۹ فیصدی کی نام نہاد اقلیت پر حکمرانی کریں۔ مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ بحقیقت یہ ہے کہ اس طریقے کے اندر اتنے خلا ہیں کہ عموماً ۵۱ فیصدی کی اکثریت بھی حاصل نہیں ہوتی اور مطلق اقلیت کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اکثریت کے اوپر حکومت بنائے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں اس وقت ہم جس حکومت کے تحت ہیں وہ ۱۹۶۲ء میں تیسرے عام الیکشن کے ذریعہ برسر اقتدار آئی ہے۔ کانگریس کو ملک میں یہ اقتدار ۷۰ فیصدی نشستوں پر قبضہ کرکے حاصل ہوا ہے، جبکہ اس کو ووٹ صرف چالیس فیصدی ملے تھے۔ یہی حال آزادی کے بعد پچھلے دونوں الکشنوں کا بھی تھا۔ ہر بار کانگریس کو پچاس فیصدی سے کم ووٹ ملے۔ مگر اس کے باوجود ہر بار اسی نے حکومت بنائی۔ کیونکہ بقیہ ووٹ پچاس فیصدی سے زائد ہونے کے باوجود مختلف پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے، اور کسی ایک پارٹی کے مقابلے میں کانگریس کے رائے دہندگان کی تعداد زیادہ تھی، صرف اشتراکی ملکوں کے مصنوعی انتخابات اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اس طرح فلسفۂ قانون کو آج تک اس مسئلہ کا کوئی واقعی حل معلوم نہ ہو سکا۔ مذہب اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ قانون کا ماخذ خدا ہے جس نے زمین و آسمان کا اور ساری طبیعی دنیا کا قانون مقرر کیا ہے۔ اسی کو حق ہے کہ وہ انسان کے تمدن و معاشرت کا قانون وضع کرے۔ اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ جس کو یہ حیثیت دی جاسکے۔ یہ جواب اتنا سادہ اور معقول ہے کہ وہ خود ہی بول رہا ہے کہ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی اور جواب نہیں ہو سکتا۔ یہ جواب اس سوال پر اسی طرح بالکل راست

آرہا ہے، جیسے کوئی ڈھکن غلط شیشوں پر نہ بیٹھ رہا ہو، اور جیسے ہی اس کے اصل مقام پر اسے لایا جائے وہ ٹھیک اس پر بیٹھ جائے۔

اس جواب میں قانون بنانے اور حکم دینے کا حق ٹھیک اس جگہ پہنچ گیا، جہاں نہ پہنچنے کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم اس کو کہاں لے جائیں۔ انسانوں کے اوپر انسان کو حاکم اور قانون ساز نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کا حق تو صرف اسی کو ہے جو سارے انسانوں کا خالق اور بالفعل ان کا طبیعی حاکم ہے۔

۲۔ قانون کا ایک بہت بڑا سوال یہ ہے کہ کیا اس کا سارا حصہ اضافی ہے۔ اس کا کوئی جزو حقیقی نوعیت بھی رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر وہ قانون جو آج رائج ہے، کل بدلا جاسکتا ہے یا اس کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو ناقابل تغیر ہے۔ اس سلسلے میں طویل ترین بحثوں کے باوجود آج تک کوئی قطعی بنیاد حاصل نہ ہوسکی۔ علمائے قانون اصولی طور پر اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ قانون میں ایک ایسا عنصر ضروری ہے جو دوامی نوعیت رکھتا ہو، اور اسی کے ساتھ اس میں ایسے اجزاء بھی ہونے چاہئیں جن میں لچک ہو تاکہ بدلتے ہوئے حالات پر انہیں بآسانی منطبق کیا جاسکے، دونوں میں سے کسی ایک پہلو کی کمی بھی قانون کے لئے سخت مضر ہے۔ امریکہ کے ایک جج مسٹر کارڈوزو ——— (JUSTICE CARDOZO) لکھتے ہیں:

"آج قانون کی اہم ترین ضروریات میں سے ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ایک ایسا فلسفۂ قانون مرتب کیا جائے جو ثبات اور تغیر کے متحارب تقاضوں کے درمیان توافق پیدا کرے۔" (THE GROWTH OF THE LAW)

ایک اور عالم قانون لکھتا ہے:

"قانون کو ضرور مستحکم ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں جمود نہیں پیدا ہونا چاہیے۔ اسی وجہ سے قانون کے متعلق مفکرین نے اس بارے میں کافی جدوجہد کی ہے کہ کسطرح استحکام اور تبدیلی کے دو طرفہ تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔"

(ROSCOE POUND INTERPRETATIONS OF LEGAL HISTORY.P-1)

مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانی قوانین میں اس قسم کا فرق پیدا کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ قانون کے کسی حصہ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ دائمی اور ناقابل تغیر ہے۔ کوئی دلیل چاہتا ہے، اور انسانی قانون ایسی کوئی دلیل پیش کرنے سے عاجز ہے۔ آج کچھ لوگ ایک قانون کو اپنی عقل سے دائمی قرار دیں گے۔ اور کل

کچھ لوگوں کی عقل کو نظر آئے گا کہ وہ دائمی ہونے کے قابل نہیں ہے اور وہ دوبارہ اس کے قابل تغیر ہونے کا اعلان کر دیں گے۔

خدا کا قانون ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے۔ خدا کا قانون ہم کو وہ تمام بنیادی اصول دے دیتا ہے جو غیر متبدل طور پر ہمارے قانون کا لازمی جزو ہونے چاہئیں۔ یہ قانون کچھ بنیادی امور کے بارے میں بنیادی پہلوؤں کا تعین کرتا ہے، اور بقیہ امور اور دیگر پہلوؤں کے بارے میں خاموش ہے۔ اس طرح وہ اس فرق کا تعین کر دیتا ہے کہ قانون کا کوئی سا حصہ دائمی ہے اور کون سا حصہ قابل تغیر ہے۔ پھر وہ خدا کا قانون ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھ یہ ترجیحی دلیل بھی رکھتا ہے کہ کیوں ہم اس تعین کو مبنی برحق سمجھیں اور اسکو لازمی قرار دیں۔

یہ خدائی قانون کی ایک بہت بڑی دین ہے۔ بلکہ ایک ایسی دین ہے جس کا بدل فراہم کرنا انسان کے لئے قطعی ناممکن ہے۔

۳۔ اسی طرح قانون کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اس بات کی کوئی معقول وجہ موجود ہو کہ وہ کیوں کسی چیز کو "جرم" قرار دیتا ہے۔ انسانی قانون کے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ جو عمل "امن عامہ یا نظم مملکت" میں خلل ڈالتا ہو وہ جرم ہے۔ اس کے بغیر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی فعل کو جرم کیسے قرار دے۔ یہی وجہ ہے کہ قوانین مروجہ کی نگاہ میں زنا اصلاً جرم نظر نہیں آتا بلکہ وہ صرف اس وقت جرم بنتا ہے جبکہ طرفین میں سے کسی نے دوسرے پر جبر کیا ہو۔ گویا انسانی قانون کے نزدیک اصل جرم زنا نہیں بلکہ جبر و اکراہ ہے۔ جس طرح زبردستی کسی کے مال پر ہاتھ ڈالنا جرم ہے۔ اسی طرح زبردستی اس کی آبرو پر دست درازی بھی جرم ہے۔ لیکن باہمی رضامندی سے جسطرح ایک کا مال دوسرے کے لئے جائز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گویا قانون کی نظر میں فریقین کی رضامندی سے ایک کی عصمت بھی دوسرے پر حلال ہو جاتی ہے۔ اس باہمی رضامندی کی شکل میں قانون، زنا کا حامی و محافظ بن جاتا ہے۔ اور اگر تیسرا شخص مداخلت کر کے زبردستی انہیں روکنا چاہے تو الٹا وہی شخص مجرم بن جائے گا۔

زنا کا ارتکاب سوسائٹی میں زبردست فساد پھیلاتا ہے۔ وہ ناجائز اولاد کے مسائل پیدا کرتا ہے۔ وہ رشتہ نکاح کو کمزور کر دیتا ہے۔ وہ سطحی لذتیت کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ وہ چوری اور خیانت کی تربیت کرتا ہے، وہ قتل اور اغوا کا فروغ دیتا ہے، وہ سارے سماج کے دل و دماغ کو گندا کر دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود قانون اسے کوئی سزا نہیں دے سکتا، کیونکہ اس کے پاس زنا کا برا ہونا

کو جرم قرار دینے کیلئے کوئی بنیاد نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی قانون کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ شراب نوشی کو جرم کیوں قرار دے۔ کیونکہ اکل و شرب انسان کا ایک فطری حق ہے۔ اس لئے وہ جو چاہے کھائے۔ اس میں قانون کو مداخلت کرنے کی کیا ضرورت۔ اس لئے اس کے نزدیک نہ شراب پینا جرم ہے، اور نہ اس سے پیدا شدہ بدمستی اصلاً قابل مواخذہ ہے۔ البتہ نشے کی حالت میں اگر مخمور کسی سے گالم گلوچ کر بیٹھا یا ہاتھا پائی کی نوبت آگئی۔ یا شارع عام پر وہ اس طرح جھومتا ہوا چلا کہ خمار اسکی حرکات سے بالکل نمایاں تھا، تب کہیں جاکر قانون اس پر ہاتھ ڈالنا جائز سمجھے گا۔ گویا انسانی قانون کی رو سے فی الحقیقت شراب نوشی کا فعل قابل گرفت نہیں ہے۔ بلکہ اصل قابل گرفت جرم دوسروں کو ایک خاص شکل میں ایذا پہنچانا ہے۔

شراب نوشی صحت کو تباہ کرتی ہے، وہ مال کے ضیاع اور بالآخر اقتصادی بربادی تک لے جا سکتی ہے، اس سے اخلاق کا احساس کمزور پڑتا ہے، اور انسان دھیرے دھیرے حیوان بن جاتا ہے۔ شراب مجرمین کی ایک بہترین مددگار ہے جس کو پینے کے بعد لطیف احساسات مفلوج ہو جاتے ہیں۔ اور پھر قتل، چوری، ڈاکہ اور عصمت دری کے واقعات کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر قانون اسے بند نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کہ وہ کیوں لوگوں کے اختیاری اکل و شرب پر پابندی عائد کرے۔

اس مشکل کا جواب صرف خدا کے قانون میں ہے۔ کیونکہ خدا کا قانون مالک کائنات کی مرضی کا اظہار ہوتا ہے۔ کسی قانون کا خدا کا قانون ہونا بذات خود اس بات کی کافی وجہ ہے کہ وہ بندوں کے اوپر نافذ ہو۔ اس کے بعد اس کے لئے کسی اور سبب کی ضرورت نہیں۔ اس طرح خدائی قانون، قانون کی اس ضرورت کو پورا کرتا ہے کہ کس بنیاد پر کسی فعل کو قانون کی زد میں لایا جائے۔

دیانتداری اور خدمت ہمارا شعار ہے

نوشہرہ فلور ملز لمیٹڈ نوشہرہ اپنے ان ہزاروں کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔
جنہوں نے ہمارا

پستول مارکہ آٹا

پسند فرما کر ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہمیشہ پستول مارکہ آٹا استعمال کیجئے جسے آپ بہترین پائیں گے۔

نوشہرہ فلور ملز جی۔ٹی روڈ نوشہرہ ——— فون نمبر ۱۲۶